سیرت
پیغام کا
سید ابوالاعلیٰ مودودی
مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

مطبوعات اشاعت اسلام ٹرسٹ ۴۶۱

سیرت کا پیغام

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی

سیرت کا پیغام

بار اوّل ——— ۱۹۸۰ء ——— ۵۰۰۰

بار دوم ——— ۱۹۸۵ء ——— ۵۰۰۰

بار سوم ——— ۱۹۸۹ء ——— ۲۰۰۰

قیمت: 3-00

مطبوعہ

جے۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرز دہلی

عرضِ ناشر

یہ کتابچہ "سیرت کا پیغام" عصر حاضر کے ایک عظیم مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہٗ کی اس تقریر پر مشتمل ہے جو انھوں نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی دعوت پر یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں کی تھی۔ مولانا مودودی جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے محتاجِ تعارف نہیں۔ مولانا کا سائینٹفک طرزِ استدلال اسلام سے متعلق جدید ذہن کے شبہات رفع کرنے میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کتابچہ میں بھی سائینٹفک و تاریخی طرزِ استدلال برتا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی یافتہ آج کی انسانیت کو ہادیٔ اعظم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کتنی اشد ضرورت ہے۔

یہ کتابچہ اُن لوگوں کے لئے جو ہر طرح کے تعصبات و ذہنی تحفظات سے بالاتر ہوکر سیرت النبیؐ کا پیغام سمجھنا چاہتے ہیں بہت مفید ہوگا۔

"ناشر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرت کا پیغام

جناب وائس چانسلر صاحب، صدر انجمن اتحاد طلبہ اور طالبین و طالبات
مجھے دعوت دی گئی ہے کہ میں آپ کے اس اجتماع میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے پیغام پر کچھ عرض کروں۔ اس مضمون پر اگر منطقی ترتیب کے ساتھ کلام کیا جائے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ایک نبی کی سیرت ہی کا پیغام کیوں؟ کسی اور کا پیغام کیوں نہیں؟ اور انبیاء میں سے بھی صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت کا پیغام کیوں؟ دوسرے انبیاء اور پیشوایانِ مذاہب کی سیرتوں کا پیغام کیوں نہیں؟ اس سوال پر آغاز ہی میں بحث کرنا اسلئے ضروری ہے کہ ہمارا ذہن اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جائے کہ درحقیقت ہم قدیم اور جدید زمانوں کے کسی رہنما کی سیرت میں نہیں بلکہ ایک نبی کی سیرت ہی میں ہدایت پا سکتے ہیں، اور کسی دوسرے نبی یا پیشوائے مذہب کی زندگی میں نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ہم کو وہ صحیح اور مکمل ہدایات مل سکتی ہے جس کے ہم فی الواقع محتاج ہیں

خدائی ہدایت کی ضرورت

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ علم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے

اس کائنات کو بنایا ہے اور اس میں انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس کے سوا کائنات کی حقیقتوں کا اور خود انسانی فطرت اور اس کی حقیقت کا علم اور کس کو ہو سکتا ہے؟ خالق ہی تو اپنی مخلوق کو جان سکتا ہے۔ مخلوق اگر کچھ جانے گی تو خالق کے بتانے ہی سے جانے گا۔ اس کے پاس خود اپنا کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے وہ حقیقت کو جان سکے۔

اس معاملے میں دو قسم کی چیزوں کا فرق اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے تاکہ غلط مبحث نہ ہونے پائے۔

ایک قسم کی چیزیں وہ ہیں جنہیں آپ حواس سے محسوس کر سکتے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی معلومات کو فکر و استدلال اور مشاہدات و تجربات کی مدد سے مرتب کر کے نئے نئے نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس نوعیت کی چیزوں کے بارے میں عالم بالا سے کوئی تعلیم آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کی اپنی تلاش و جستجو، غور و فکر اور تحقیق و اکتشاف کا دائرہ ہے۔ اسے آپ پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے گرد و پیش کی دنیا میں پائی جانے والی اشیاء کو ڈھونڈھ ڈھونڈ کر نکالیں ان میں کام کرنے والی قوتوں کو معلوم کریں، ان کے اندر کارفرما قوانین کو سمجھیں، اور ترقی کی راہ میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔ اگرچہ اس معاملے میں بھی آپ کے خالق نے آپ کا ساتھ چھوڑ نہیں دیا ہے۔ وہ تاریخ کے دوران میں بالکل غیر محسوس طریقے سے ایک تدریج کے ساتھ اپنی پیدا کی ہوئی دنیا سے آپ کا تعارف کراتا رہا ہے۔ واقفیت کے نئے نئے دروازے آپ پر کھولتا رہا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً ایک الہامی طریقے سے کسی نہ کسی انسان کو ایسی بات سُجھاتا رہا ہے جس سے وہ کوئی نئی چیز ایجاد، یا کوئی نیا قانون دریافت کر سکے۔ لیکن بہر حال ہے یہ انسانی علم ہی کا دائرہ جس کے لئے کسی نبی اور کسی کتاب کی حاجت نہیں ہے، اور اس دائرے میں جو معلومات مطلوب ہیں اُنہیں حاصل کرنے کے ذرائع انسان کو دے دیئے گئے ہیں۔

دوسری قسم کی چیزیں وہ ہیں جو ہمارے حواس کی پہنچ سے بالاتر ہیں۔ جن کا ادراک ہم

کسی طرح نہیں کر سکتے جنہیں نہ ہم تول سکتے ہیں، نہ ناپ سکتے ہیں، نہ اپنے علم کے ذرائع میں سے کوئی ذریعہ استعمال کرکے ان کو معلوم کر سکتے ہیں۔ فلسفی اور سائنسداں ان کے متعلق اگر کوئی رائے قائم کرتے ہیں تو وہ محض قیاس پر مبنی ہوتی ہے جسے علم نہیں کہا جا سکتا۔ یہ آخری حقیقتیں (ULTIMATE REALITIES) ہیں جن کے بارے میں استدلالی نظریات کو خود وہ لوگ بھی یقینی قرار نہیں دے سکتے جنہوں نے ان نظریات کو پیش کیا ہے اور اگر وہ اپنے علم کی حدود کو جانتے ہوں تو اُن پر نہ خود ایمان لا سکتے ہیں نہ کسی کو ایمان لانے کی دعوت دے سکتے ہیں

انبیاء کی پیروی کی ضرورت

اس دائرے میں علم اگر پہنچتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے پہنچتا ہے کیونکہ وہی حقائق کا جاننے والا ہے اور جس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ علم دیتا ہے وہ وحی ہے جو صرف انبیاء پر نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آج تک کبھی یہ نہیں کیا کہ ایک کتاب چھاپ کر ہر انسان کے ہاتھ میں دے دی ہو اور اس سے کہا ہو کہ اسے پڑھ کر خود معلوم کرلے کہ تیری اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت کے لحاظ سے دنیا میں تیرا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ اس علم کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے اس نے ہمیشہ انبیاء ہی کو ذریعہ بنایا ہے۔ تاکہ وہ صرف اس علم کی تعلیم ہی دے کر نہ رہ جائیں۔ بلکہ اسے سمجھائیں بھی، اس کے مطابق عمل بھی کر کے دکھائیں، اس کے خلاف چلنے والوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش بھی کریں اور اسے قبول کرنے والوں کو ایک ایسے معاشرے کی شکل میں منظم بھی کردیں جس کی زندگی کا ہر شعبہ اس علم کا عملی مظہر ہو۔

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم رہنمائی کے لیے صرف ایک نبی کی سیرت ہی کے محتاج ہیں۔ کوئی غیر نبی اگر نبی کا پیرو نہ ہو تو خواہ وہ کیسا ہی متبحر عالم اور دانا و فرزانہ ہو، ہمارا رہنما نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے پاس حقیقت کا علم نہیں ہے اور جسے

حقیقت کا علم نہ ہو وہ ہیں کوئی صحیح و برحق نظام حیات نہیں دے سکتا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسرے انبیاء سے ہدایت نہ ملنے کی وجہ

اب اس سوال کو لیجئے کہ جن بزرگوں کو ہم انبیاء کی حیثیت سے جانتے ہیں، اور جن پیشوایان مذاہب کے بارے میں گمان کیا جاسکتا ہے کہ شاید وہ نبی ہوں، ان میں سے ہم صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت سے کیوں پیغام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ؟ کیا یہ کسی قسم کے تعصب کی وجہ سے ہے یا اس کی کوئی معقول وجہ ہے۔ ؟

میں عرض کرتا ہوں کہ اس کی ایک نہایت معقول وجہ ہے۔ جن انبیاء کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے ان کو اگرچہ ہم یقینی طور پر نبی مانتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کی تعلیم اور سیرت بھی ہم تک کسی قابل اعتماد اور مستند ذریعہ سے نہیں پہنچی ہے کہ ہم اس کی پیروی کر سکیں حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام بلاشبہ نبی تھے، اور ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر ان پر نازل ہونے والی کوئی کتاب آج محفوظ شکل میں موجود نہیں ہے کہ اس سے ہم ہدایت حاصل کرسکیں اور ان میں سے کسی کی زندگی کے حالات بھی ایسے محفوظ اور معتبر طریقے سے ہم تک نہیں پہنچے ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں اُن کو اپنا رہنما بنا سکیں۔ اگر ان سارے انبیاء کی تعلیمات اور سیرت پر کوئی شخص کچھ لکھنا چاہے تو چند صفحات سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ اور وہ بھی صرف قرآن کی مدد سے۔ کیونکہ قرآن کے سوا اُن کے بارے میں کوئی مستند مواد موجود نہیں ہے۔

دینِ یہود کی کتابوں اور انبیاء کا حال

حضرت موسیٰ اور اُن کے بعد آنے والے انبیاء اور اُن کی تعلیمات کے متعلق کہا جاتا ہے وہ بائیبل کے عہدِ عتیق (OLD TESTAMENT) میں ہیں۔ لیکن تاریخی اعتبار سے ذرا بائبل کا جائزہ لے کر دیکھئے۔ اصل تورات جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی، چھٹی صدی قبل مسیح میں بیت المقدس کی تباہی کے وقت ضائع ہو چکی تھی اور اسی کے ساتھ دوسرے اُن انبیاء کے صحیفے بھی ضائع ہو گئے تھے جو اس زمانے سے پہلے ہو گزرے تھے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں جب بنی اسرائیل بابل کی اسیری سے رہا ہو کر فلسطین پہنچے تو حضرت عُزیر (EZRA) نے چند دوسرے بزرگوں کی مدد سے حضرت موسیٰ کی سیرت اور بنی اسرائیل کی تاریخ مرتب کی اور اسی میں تورات کی وہ آیات بھی حسب موقع درج کر دیں جو انہیں اور اُن کے مددگاروں کو دستیاب ہو سکیں۔ اس کے بعد چوتھی صدی قبل مسیح سے لے کر دوسری صدی قبل مسیح تک مختلف لوگوں نے (جو نہ معلوم کون تھے) ان انبیاء کے صحیفے (نہ معلوم کن ذرائع سے) تصنیف کر لیے جو اُن سے کئی صدی قبل گذر چکے تھے۔ مثلاً ۳۰۰ قبل مسیح میں حضرت یونس ؑ کے نام سے ایک کتاب کسی شخص نے لکھ کر بائیبل میں درج کر دی، حالانکہ وہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے نبی تھے۔ زبور (PSALMS) حضرت داؤد کی وفات کے پانچ سو برس بعد لکھی گئی اور اس میں حضرت داؤد کے علاوہ تقریباً ایک سو دوسرے شاعروں کی نظمیں بھی شامل کر دی گئیں جو معلوم نہیں کن ذرائع سے زبور مرتب کرنے والوں کو پہنچی تھیں۔ حضرت سلیمان کی وفات ۹۳۳ ق م میں ہوئی اور اَمثالِ سلیمان (PROVERBS) ۲۵۰ قبل مسیح میں لکھی گئی اور اس میں دوسرے بہت سے حکماء کے اقوال بھی شامل کر دیئے گئے۔

غرض، بائیبل کی کسی کتاب کی سند بھی ان انبیاء تک نہیں پہنچتی جن کی طرف وہ منسوب ہے۔ اس پر مزید یہ کہ عبرانی بائیبل کی یہ کتابیں بھی ۷۰ء میں بیت المقدس کی دوسری تباہی کے وقت ضائع ہو گئیں اور ان کا صرف یونانی ترجمہ باقی رہ گیا جو ۲۵۰ قبل مسیح سے پہلی صدی قبل مسیح تک کیا گیا تھا۔ عبرانی بائیبل کو دوسری صدی عیسوی میں یہودی علماء نے ان مسودات کی مدد سے مرتب کیا جو بچے رہ گئے تھے اس کا قدیم ترین نسخہ جو اب پایا جاتا ہے ۹۱۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی عبرانی نسخہ اب موجود نہیں ہے۔ بحیرۂ مردار (DEAD SEA) کے قریب غار قمران میں جو عبرانی خریطے (SCROLLS) ملے ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں بائیبل کے صرف چند منتشر اجزاء ہی پائے جاتے ہیں۔ بائیبل کی پہلی پانچ کتابوں کا جو مجموعہ سامریوں (SAMARITANS) کے ہاں رائج ہے اس کا قدیم ترین نسخہ گیارہویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔ یونانی ترجمہ جو تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح میں کیا گیا تھا وہ بے شمار غلطیوں سے لبریز تھا۔ اور اُس ترجمے سے لاطینی زبان کا ترجمہ دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں ہوا۔ حضرت موسیٰ اور بعد کے انبیاء بنی اسرائیل کے حالات اور تعلیمات کے بارے میں اس مواد کو آخر کس معیار کے لحاظ سے مستند (AUTHENTIC) کہا جا سکتا ہے۔؟

اس کے علاوہ یہودیوں میں کچھ سینہ بسینہ روایات بھی پائی جاتی تھیں جنہیں زبانی قانون (ORAL LAW) کہا جاتا تھا۔ یہ تیرہ چودہ سو برس تک غیر مکتوب رہیں۔ دوسری صدی عیسوی کے آخر اور تیسری صدی کے آغاز میں ربی یہودہ ابن شمعون نے ان کو مشنا (MISHNAH) کے نام سے تحریری شکل دی۔ فلسطینی علمائے یہود نے ان کی شرحیں حلقہ (HALAKAH) کے نام سے اور بابلی علماء نے ہگادہ (HAGGADAH) کے نام سے تیسری اور

پانچویں صدی میں لکھیں، اور انہی تین کتابوں کا مجموعہ تلمود کہلاتا ہے۔ ان کی کسی روایت کی کوئی سند نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ کن لوگوں سے کن لوگوں تک پہنچیں۔

حضرت عیسیٰ اور دینِ نصاریٰ کی کتابوں کا حال

کچھ ایسا ہی حال حضرت عیسیٰ کی سیرت اور تعلیمات کا ہے۔ اصل انجیل جو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعہ ان پر نازل ہوئی تھی اسے اُنہوں نے زبانی ہی لوگوں کو سُنایا اور اُن کے شاگردوں نے بھی زبانی ہی اسے دوسروں تک اس طرح پہنچایا کہ آں جناب کے حالات اور انجیل کی آیات سب کو خلط ملط کر دیا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی مسیح کے زمانے میں یا اُن کے بعد لکھی نہیں گئی۔ لکھنے کا کام اُن عیسائیوں نے کیا جن کی زبان یونانی تھی۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ کی زبان سریانی (SYRIAC) یا آرامی (ARAMAIC) تھی۔ اور اُن کے شاگرد بھی یہی زبان بولتے تھے۔ یونانی زبان بولنے والے بہت سے مصنفین نے ان روایات کو آرامی زبان میں سُنا اور یونانی میں لکھا۔ ان مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں میں سے کوئی بھی ۷۰ء سے پہلے کی نہیں ہے اور ان میں سے کسی نے بھی کسی واقعہ یا حضرت عیسیٰ کے کسی قول کی سند نہیں بیان کی جس سے معلوم ہوتا کہ انہوں نے کون سی بات کس سے سُنی تھی۔ پھر اُن کی لکھی ہوئی کتابیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔ بائیبل کے نئے عہد نامے (NEW TESTAMENT) کے ہزاروں یونانی نسخے جمع کیے گئے، مگر ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کا نہیں ہے بلکہ زیادہ تر گیارہویں سے چودھویں صدی تک کے ہیں۔ مصر میں پاپیرس پر لکھے ہوئے جو منتشر اجزاء ملے ہیں ان میں سے بھی کوئی تیسری صدی سے قدیم تر نہیں ہے۔ یونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کس نے کب اور کہاں کیا۔؟ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ چوتھی صدی

میں پوپ کے حکم سے اُس پر نظر ثانی کا کام کیا گیا؟ اور پھر سولہویں صدی میں اسے چھوڑ کر یونانی سے لاطینی میں ایک نیا ترجمہ کر دیا گیا۔ یونانی سے سُریانی زبان میں چاروں انجیلوں کا ترجمہ غالباً ۲۰۰ء میں ہوا تھا، مگر اس کا بھی قدیم ترین نسخہ جو اَب پایا جاتا ہے چوتھی صدی کا لکھا ہوا ہے، اور پانچویں صدی کا جو قلمی نسخہ ملا ہے وہ اس سے کافی مختلف ہے۔ سُریانی سے جو عربی ترجمے کئے گئے ان میں سے بھی کوئی ترجمہ آٹھویں صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ستّر کے قریب انجیلیں لکھی گئیں تھیں مگر اُن میں سے صرف چار کو پیشوایانِ دینِ مسیحؑ نے قبول کیا اور باقی سب کو رد کر دیا۔ کچھ نہیں معلوم کہ قبول کیا تو کیوں اور رد کیا تو کیوں۔ کیا اس مواد کی بنا پر حضرت عیسیٰ کی سیرت اور اُن کی تعلیمات کو کسی درجے میں بھی مستند مانا جا سکتا ہے۔؟

دوسرے پیشوایانِ مذہب کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ مثلاً زرتشت (ZOROASTER) کو لیجئے جس کا صحیح زمانہ پیدائش بھی اب ٹھیک معلوم نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سکندر کی فتح ایران سے ڈھائی سو سال پہلے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی مسیح سے ساڑھے پانچ سو سال قبل۔ اس کی کتاب اَوَسْتا اپنی اصل زبان میں اب ناپید ہے۔ اور وہ زبان بھی مردہ ہو چکی ہے جس میں وہ لکھی یا زبانی بیان کی گئی تھی۔ نویں صدی عیسوی میں اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ ۹ جلدوں میں تشریح کے ساتھ کیا گیا تھا۔ مگر اُن میں سے پہلی ۲ جلدیں ضائع ہو گئیں، اور اب اس کا جو قدیم ترین نسخہ پایا جاتا ہے وہ تیرہویں صدی کے وسط کا لکھا ہوا ہے۔ یہ تو ہے زرتشت کی پیش کردہ کتاب کا حال۔ رہا خود اس کی سیرت کا معاملہ، تو اُس کے متعلق ہماری معلومات اس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں کہ ۳۰ سال کی عمر میں اس نے تبلیغ شروع کی۔ دو سال بعد بادشاہ گشتاسپ نے اس کی پیروی اختیار کر لی۔ اور اُس کا مذہب سرکاری مذہب بن گیا۔ ۷۷ سال وہ زندہ رہا اور اس کی موت پر جتنا زمانہ گزرتا گیا اس کی زندگی عجیب و غریب افسانوں

کا مجموعہ بنتی چلی گئی جن میں سے کسی کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔

دنیا کی مشہور ترین مذہبی شخصیتوں میں سے ایک بودھ بھی تھے۔ زرتشت ہی کی طرح اُن کے متعلق بھی یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ بھی نبی ہوں۔ مگر انھوں نے سرے سے کوئی کتاب ہی پیش نہیں کی، نہ ان کے پیرووں نے کبھی یہ دعوی کیا کہ وہ کوئی کتاب لائے تھے۔ ان کی وفات کے سو سال بعد ان کے اقوال اور حالات کو جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا اور صدیوں تک چلتا رہا۔ مگر اس طرح کی جتنی کتابیں بدھ مذہب کی اصل کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے کسی کے اندر بھی کوئی سند درج نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ کس ذریعہ سے ان احوال و اقوال اور تعلیمات کے مرتب کرنے والوں کو بدھ کے حالات اور اُن کے اقوال پہنچے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہم دوسرے انبیاء اور مذہبی پیشواؤں کی طرف رجوع کریں بھی تو اُن کے بارے میں کوئی مستند ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے ہم ان کی تعلیمات اور ان کی زندگیوں سے اطمینان اور یقین کے ساتھ رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم کسی ایسے نبی کی طرف رجوع کریں جس نے کوئی قابل اعتماد اور تحریف اور آمیزش سے پاک کتاب چھوڑی ہو اور جس کے مفصل حالات و اقوال اور اعمال معتبر ذرائع سے ہم تک پہنچے ہوں تاکہ ہم اُن سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ ایسی شخصیت پوری دنیا کی تاریخ میں صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات ہے۔

انھوں نے ایک کتاب (قرآن) اس صریح دعوے کے ساتھ پیش کی کہ یہ اللہ تعالٰی کا کلام ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ اس کتاب کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یقینی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کوئی قول بھی اس میں شامل نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے اقوال کو اس سے بالکل الگ رکھا گیا ہے۔ بائیبل کی طرح آپؐ کی زندگی

کے حالات اور عربوں کی تاریخ اور زمانۂ نزولِ قرآن میں پیش آنے والے واقعات کو اس میں کلامِ الٰہی کے ساتھ خلط ملط نہیں کر دیا گیا ہے۔ یہ خالص کلام اللہ (WORD OF GOD) ہے۔ اس کے اندر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا ایک لفظ بھی شامل نہیں ہوا ہے۔ اس کے الفاظ میں سے ایک لفظ بھی کم نہیں ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے جوں کا توں یہ ہمارے زمانے تک منتقل ہوا ہے۔

یہ کتاب جس وقت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونی شروع ہوئی تھی اُسی وقت سے آپؐ نے اسے لکھوانا شروع کر دیا تھا۔ جب کوئی وحی آتی اُسی وقت آپؐ اپنے کسی کاتب کو بُلانے اور اُسے لکھوا دیتے تھے۔ لکھنے کے بعد وہ آپؐ کو سنایا جاتا تھا اور جب آپ اطمینان کر لیتے تھے کہ کاتب نے اسے صحیح لکھا ہے۔ تب آپؐ اسے ایک محفوظ جگہ رکھ دیتے تھے۔ ہر نازل شدہ وحی کے متعلق آپؐ کاتب کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے کس سورہ میں کس آیت سے پہلے اور کس کے بعد درج کیا جائے۔ اس طرح آپ قرآن کو ترتیب بھی دیتے رہے تھے یہاں تک کہ وہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

پھر نماز کے متعلق آغازِ اسلام ہی سے یہ ہدایت تھی کہ اس میں قرآن مجید پڑھا جائے۔ اس لیے صحابہ کرام اس کے نزول کے ساتھ ساتھ اس کو یاد کرتے جاتے تھے، بہت سے لوگوں نے اسے پورا یاد کر لیا۔ اور اُن سے بہت زیادہ بڑی تعداد ایسے اصحاب کی تھی جنہوں نے کم و بیش اس کے مختلف حصّے اپنے حافظے میں محفوظ کر لیے تھے۔ ان کے علاوہ متعدد صحابہ جو پڑھے لکھے تھے قرآن کے مختلف حصوں کو بطور خود لکھ بھی رہے تھے۔ اس طرح قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں چار طریقوں سے محفوظ ہو چکا تھا۔

۱۔ آپ نے خود کاتبینِ وحی سے اس کو از اوّل تا آخر لکھوایا۔

۲۔ بہت سے صحابہؓ نے پورا کا پورا قرآن لفظاً بلفظاً یاد کر لیا۔

۳۔ صحابۂ کرامؓ میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے قرآن کا کوئی نہ کوئی حصہ تھوڑا یا بہت یاد نہ کر لیا ہو، کیونکہ اسے نماز میں پڑھنا ضروری تھا۔ اور صحابہ کی تعداد کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آخری حج میں ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہؓ شریک تھے۔

۴۔ پڑھے لکھے صحابہ کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اپنے طور پر قرآن کو لکھ بھی لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کر اس کی صحت کا اطمینان بھی کر لیا تھا۔

پس یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ آج جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے یہ لفظ بلفظ وہی ہے جسے رسول اللہ نے کلام اللہ کی حیثیت سے پیش فرمایا تھا۔ حضور کی وفات کے بعد آپ کے پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تمام حافظوں اور تمام تحریری نوشتوں کو جمع کر کے اس کا ایک مکمل نسخہ کتابی صورت میں لکھوالیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسی کی نقلیں سرکاری طور پر دنیائے اسلام کے مرکزی مقامات کو بھیجی گئیں۔ ان میں سے دو نقلیں آج بھی دنیا میں موجود ہیں، ایک استنبول میں اور دوسری تاشقند میں، جس کا جی چاہے قرآن مجید کا کوئی مطبوعہ نسخہ لیجا کر اُن سے ملالے۔ کوئی فرق وہ نہ پائے گا اور فرق ہو کیسے سکتا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک ہر پشت (GENERATION) میں لاکھوں اور کروڑوں حافظ موجود رہے ہیں۔ ایک لفظ بھی اگر کوئی شخص بدلے تو یہ حفاظ اس کی غلطی پکڑ لیں گے پچھلی صدی کے آخر میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے ایک انسٹی ٹیوٹ نے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے ہر زمانے کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے قلمی اور مطبوعہ ۴۲ ہزار نسخے جمع کیے تھے۔ پچاس سال تک ان پر تحقیقی کام کیا گیا۔ آخر میں جو رپورٹ پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ ان نسخوں میں کتابت کی غلطیوں کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔ حالانکہ یہ پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی تک کے نسخے تھے۔ اور دنیا کے ہر حصے سے فراہم کیے گئے تھے۔ افسوس کہ دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنی پر بمباری

کی گئی تو وہ انسٹی ٹیوٹ تباہ ہوگیا لیکن اس کی تحقیقات کے نتائج دنیا سے ناپید نہیں ہوئے
ایک اور بات قرآن کے متعلق یہ بھی نگاہ میں رکھیے کہ جس زبان میں یہ نازل ہوا تھا وہ
ایک زندہ زبان ہے ۔عراق سے مراکو تک تقریباً ۱۲ کروڑ انسان آج بھی اسے مادری زبان
کی حیثیت سے بولتے ہیں، اور غیر عرب دنیا میں بھی لاکھوں آدمی اسے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں
عربی زبان کی گرامر، اس کی لغت، اس کے الفاظ کے تلفظ اور اس کے محاورے ۱۴ سو برس سے
جوں کے توں قائم ہیں۔ آج ہر عربی دان اسے پڑھکر اسی طرح سمجھ سکتا ہے جس طرح ۱۴ سو برس پہلے کے عرب سمجھتے تھے۔
یہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم خصوصیت جو اُن کے سوا کسی نبی اور کسی
پیشوائے مذہب کو حاصل نہیں ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے
جو کتاب اُن پر نازل ہوئی تھی وہ اپنی اصل زبان میں اپنے اصل الفاظ کے ساتھ بلا تغیر و
تبدل موجود ہے ۔

سیرت وسنتِ رسول کا پایۂ اِستناد

اب دوسری خصوصیت کو دیکھیے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء
اور پیشوایانِ مذاہب میں یکتا ہیں ۔ وہ یہ کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب کی طرح آپؐ کی سیرت
بھی محفوظ ہے جس سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں ۔بچپن سے لیکر آخری
سانس تک جتنے لوگوں نے آپ کو دیکھا، آپؐ کے حالاتِ زندگی دیکھے ، آپؐ کے اقوال سنے
آپ کی تقریریں سنیں، آپ کو کسی چیز کا حکم دیتے سُنا یا کسی چیز سے منع کرتے سُنا، ان کی ایک
عظیم تعداد نے سب کچھ یاد رکھا اور بعد کی نسل تک اسے پہنچایا ۔بعض محققین کے نزدیک
ایسے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچتی ہے جنہوں نے آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے ہوئے

واقعات بعد کی نسل تک منتقل کیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احکام خود لکھوا کر بھی بعض لوگوں کو دیئے یا بھیجے تھے جو بعد کے لوگوں کو ملے۔ صحابہ میں سے کم از کم چھ اصحاب ایسے تھے جنہوں نے آپؐ کی احادیث لکھ کر آپ کو سُنادی تھیں تاکہ اُن میں غلطی نہ رہ جائے۔ یہ تحریریں بھی بعد میں آنے والوں کو ملیں۔ حضوؐر کی وفات کے بعد کم از کم پچاس صحابہؓ نے آپؐ کے حالات، واقعات اور اقوال تحریری صورت میں جمع کیے اور یہ ذخیرۂ علم بھی ان لوگوں تک پہنچا جنہوں نے بعد میں احادیث کو جمع اور مرتب کرنے کی خدمت انجام دی۔ پھر جن صحابہ نے سیرت کی معلومات زبانی روایت کیں ان کی تعداد، جیسا کہ ابھی میں عرض کر چکا ہوں، بعض محققین کے نزدیک ایک لاکھ تک پہنچتی ہے۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کیوں کہ آخری حج جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمایا، جسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے اس میں ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی موجود تھے۔ اتنے آدمیوں نے آپ کو حج کرتے ہوئے دیکھا۔ آپؐ سے حج کا طریقہ سیکھا۔ وہ تقریریں سُنیں جو حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے کیں۔ کیسے ممکن ہے کہ اتنے لوگ جب ایسے اہم موقع پر آپؐ کے ساتھ حج میں شریک ہونے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں واپس پہونچے ہوں گے تو وہاں ان کے عزیزوں، دوستوں اور ہم وطنوں نے ان سے اس سفر کے حالات نہ پوچھے ہوں۔ اور حج کے احکام دریافت نہ کیے ہوں۔ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم شخصیت کے اس دنیا سے گذر جانے کے بعد لوگ کس اشتیاق کے ساتھ آپؐ کے احوال واقوال اور احکام وہدایات ان لوگوں سے پوچھتے ہوں گے جنہوں نے آپؐ کو دیکھا تھا اور آپؐ کے ارشادات سُنے تھے۔

صحابہؓ سے جو روایات بعد کی نسلوں کو پہنچی تھیں ان کے بارے میں ابتدا ہی سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہتا

اس کو یہ بتانا پڑتا تھا کہ اس نے وہ بات کس ... شاید ... اور پھر اوپر سلسلہ بہ سلسلہ کون کس سے
وہ بات سنتا اور آگے بیان کرتا رہا ... اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت کی
پوری کڑیاں دیکھی جاتی تھیں ... یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ صحیح طور سے حضورؐ سے منقول ہوئی
ہے۔ اگر ... کی پوری کڑیاں نہ ملتی تھیں تو اس کی صحت مشتبہ ہو جاتی تھی۔ اگر کڑیاں نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتیں لیکن بیچ میں کوئی راوی ناقابل اعتماد ہوتا تو ایسی روایت بھی
قبول نہ کی جاتی تھی۔ آپ ذرا غور کریں تو آپکو محسوس ہوگا کہ دنیا کے کسی دوسرے انسان کے حالات
اس طرح سے مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف نبی کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے
کہ آپؐ کے بارے میں کوئی بات بھی سند کے بغیر تسلیم نہیں کی گئی، اور سند میں بھی صرف یہی دیکھا گیا کہ
ایک حدیث کا سلسلہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے یا نہیں، بلکہ یہ بھی
دیکھا گیا کہ اس سلسلے کے تمام راوی بھروسے کے قابل ہیں یا نہیں، اس غرض کے لئے راویوں کے حالات
کی بھی پوری جانچ پڑتال کی گئی اور اس پر مفصل کتابیں لکھ دی گئیں جن سے معلوم کیا جا سکتا ہے
کہ کون قابل اعتماد تھا اور کون نہ تھا۔ کس کی سیرت و کردار کا کیا حال تھا۔ کس کا حافظہ ٹھیک تھا
اور کس کا ٹھیک نہ تھا۔ کون اس شخص سے ملا تھا جس سے اس نے روایت نقل کی ہے اور کون
اس سے ملاقات کے بغیر ہی اس کا نام لے کر روایت بیان کر رہا ہے۔ اس طرح اتنے بڑے
پیمانے پر راویوں کے متعلق معلومات جمع کی گئی ہیں کہ آج بھی ہم ایک ایک حدیث کے متعلق یہ جانچ
سکتے ہیں کہ وہ قابل اعتماد ذرائع سے آئی ہے یا ناقابل اعتماد ذرائع سے۔ کیا انسانی تاریخ میں کوئی
دوسرا شخص ایسا پایا جاتا ہے جس کے حالاتِ زندگی اس قدر مستند طریقے سے منقول ہوئے ہوں!
اور کیا اس کی کوئی مثال ملتی ہے کہ ایک شخص کے حالات کی تحقیق کے لئے اُن ہزارہا آدمیوں کے
حالات پر کتابیں لکھ دی گئی ہوں جنہوں نے اس ایک شخصیت کے متعلق کوئی روایت بیان کی ہو؟

موجودہ دور کے عیسائی اور یہودی علماء احادیث کی صحت کو مشتبہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا جو زور صرف کر رہے ہیں اس کی اصل وجہ یہ حسد ہے کہ ان کے دین کی کتابوں اور اُن کے پیشوایانِ دین کے حالات کا سرے سے کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ اسی جلن کے باعث انھوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تنقید کے معاملہ میں علمی دیانت (INTELLECTUAL HONESTY) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

حضورؐ کی زندگی کا ہر پہلو معروف و معلوم ہے

سیرتِ رسولِ اکرمؐ کی صرف یہی ایک خصوصیت نہیں ہے کہ وہ ہمیں نہایت مستند ذرائع سے پہنچی ہے بلکہ اس کی یہ بھی امتیازی خصوصیت ہے کہ اس میں آپؐ کی زندگی کے ہر پہلو کی اتنی تفصیلات ملتی ہیں جو تاریخ کے کسی دوسرے شخص کی زندگی کے بارے میں نہیں ملتیں۔ آپؐ کا خاندان کیسا تھا۔ آپؐ کی نبوت سے پہلے کی زندگی کیسی تھی۔ آپؐ کو نبوت کس طرح ملی۔ آپؐ پر وحی کیسے نازل ہوتی تھی۔ آپؐ نے اسلام کی دعوت کس طریقے سے پھیلائی۔ مخالفتوں اور مزاحمتوں کا مقابلہ کس طرح کیا۔ اپنے ساتھیوں کی تربیت کیسے کی۔ اپنے گھر میں آپؐ کس طرح رہتے تھے۔ اپنی بیویوں اور بچوں سے آپؐ کا برتاؤ کیسا تھا۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں سے آپؐ کا معاملہ کیسا تھا۔ کس اخلاق کی تعلیم آپؐ دیتے تھے۔ اور آپؐ کا اپنا اخلاق کیسا تھا۔ کس چیز کے کرنے کا آپؐ نے حکم دیا۔ کس کام سے آپؐ نے منع کیا۔ کس کام کو آپؐ نے ہوتے دیکھا اور منع نہ کیا اور کس چیز کو ہوتے دیکھا اور منع فرمایا۔ یہ سب کچھ ذرا ذرا سی تفصیلات کے ساتھ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ آپؐ ایک فوجی جنرل بھی تھے اور آپؐ کی قیادت میں جتنی لڑائیاں ہوئیں اُن سب کا مفصل حال ہمیں ملتا ہے آپؐ ایک حاکم بھی تھے اور آپؐ کی حکومت کے تمام حالات

ہمیں ملتے ہیں۔ آپؐ ایک جج بھی تھے اور آپؐ کے سامنے پیش ہونے والے مقدمات کی پوری پوری رودادیں ہمیں ملتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس مقدمے میں آپؐ نے کیا فیصلہ فرمایا۔ آپؐ بازاروں میں بھی نکلتے تھے اور دیکھتے تھے کہ لوگ خرید و فروخت کے معاملات کس طرح کرتے ہیں۔ جس کام کو غلط ہوتے ہوئے دیکھتے اس سے منع فرماتے تھے۔ اور جو کام صحیح ہوتے دیکھتے اس کی توثیق فرماتے تھے۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق آپؐ نے تفصیلی ہدایات نہ دی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بے جا تعصب کے بغیر، پورے علم و یقین کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ تمام انبیاء، اور پیشوایانِ مذہب میں سے صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ ہستی ہیں جن کی طرف نوعِ انسانی ہدایت و رہنمائی کے لیے رجوع کر سکتی ہے، کیونکہ آپؐ کی پیش کی ہوئی کتاب اپنے اصل الفاظ میں محفوظ ہے، اور آپؐ کی سیرت ان تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ، جو ہدایت کے لیے درکار ہیں۔ نہایت مستند و معتبر ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔
اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آپ کی سیرتِ پاک ہمیں کیا پیغام اور کیا ہدایت دیتی ہے۔

حضورؐ کا پیغام تمام انسانوں کیلئے ہے

اوّلین چیز جو ہمیں آپؐ کی دعوت میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ رنگ و نسل اور زبان و وطن کے سارے امتیازات کو نظر انداز کر کے انسان کو بحیثیت انسان مخاطب کرتے ہیں اور چند اصول پیش کرتے ہیں جو تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے ہیں۔ ان اصولوں کو جو بھی مان لے وہ مسلمان ہے اور ایک عالمگیر اُمتِ مسلمہ کا فرد ہے، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا۔ عربی ہو یا عجمی، جہاں بھی کوئی انسان ہے، جس ملک یا قوم یا نسل میں بھی وہ پیدا ہوا ہے،

جو زبان بھی وہ بولتا ہے، اور جو رنگ بھی اس کی کھال کا ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مخاطب ہے۔ اور اگر وہ آپ کے پیش کردہ اصولوں کو مان لیتا ہے تو بالکل مساوی حقوق کے ساتھ امت مسلمہ میں شامل ہو جاتا ہے، کوئی چھوت چھات کوئی اونچ نیچ، کوئی نسلی یا طبقاتی امتیاز، کوئی لسانی یا قومی یا جغرافیائی افتراق، جو عقیدے کی وحدت قائم ہو جانے کے بعد ایک انسان کو دوسرے انسان سے جدا کرتا ہو، اس اُمت میں نہیں ہے۔

رنگ و نسل کے تعصبات کا بہترین علاج

آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت انسانیت کو میسر آئی ہے۔ انسان کو سب سے بڑھ کر جس چیز نے تباہ کیا وہ یہی امتیازات ہیں جو انسان اور انسان کے درمیان قائم کیے گئے ہیں۔ کہیں اس کو نجس قرار دیا گیا اور اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا، اس کے وہ حقوق نہیں ہیں جو برہمن کے حقوق ہیں۔ کہیں اس کو فنا کر دینے کے قابل قرار دیا گیا کیونکہ وہ آسٹریلیا اور امریکہ میں ایسے وقت پیدا ہو گیا تھا جب باہر سے آنے والوں کو اس سے زمین خالی کرانے کی ضرورت تھی۔ کہیں اس کو پکڑ کر غلام بنایا گیا اور اس سے جانوروں کی طرح خدمت لی گئی کیوں کہ وہ افریقہ میں پیدا ہو گیا تھا اور اس کا رنگ کالا تھا۔
غرض نوع انسانی کے لیے قوم، وطن، نسل، رنگ اور زبان کے یہ امتیازات قدیم ترین زمانے سے لیکر اس زمانے تک بہت بڑی مصیبت کا ذریعہ بنے رہے ہیں۔ اسی بنیاد پر لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک ملک دوسرے ملک پر چڑھ دوڑا ہے۔ ایک قوم نے دوسری قوم کو لوٹا ہے۔ اور پوری پوری نسلیں تباہ و برباد کر دی گئی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرض کا ایسا علاج فرمایا کہ دشمنان اسلام بھی مان گئے ہیں کہ رنگ، نسل اور وطن کے امتیازات کو جس کامیابی سے اسلام نے حل کیا ہے

ایسی کامیابی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

امریکہ کے افریقی النسل باشندوں کا مشہور لیڈر میلکم اکس، جو ایک زمانے میں گوری نسل کے خلاف کالی نسل کے شدید ترین تعصب کا علمبردار تھا، اسلام قبول کر کے جب حج کے لیے گیا اور اس نے دیکھا کہ مشرق، مغرب، شمال، جنوب ہر طرف سے ہر نسل کے لوگ، ہر وطن کے لوگ، ہر زبان بولنے والے لوگ چلے آرہے ہیں، سب نے ایک جیسا احرام کا لباس پہن رکھا ہے، سب ایک ہی زبان میں لبیک لبیک کے نعرے لگا رہے ہیں، ایک ساتھ طواف کر رہے ہیں، اور ایک ہی جماعت میں ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں، تو وہ پکار اٹھا کہ رنگ و نسل کے مسئلے کا صحیح حل یہی ہے۔ نہ کہ وہ جو کہ ہم اب تک کرتے رہے ہیں۔ اس مرحوم کو تو ظالموں نے قتل کر دیا مگر اس کی خود نوشت سوانح عمری شائع شدہ موجود ہے۔ اس میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ حج سے کیسا گہرا اثر اس نے قبول کیا تھا۔

یہ حج تو اسلام کی عبادات میں سے صرف ایک عبادت ہے۔ اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر اسلام کی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی دیکھے تو کسی بھی جگہ انگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ چیز کسی خاص قوم یا کسی قبیلے یا کسی نسل یا طبقے کے مفاد کے لیے ہے۔ یہ تو پورا کا پورا دین ہی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لیے ہے اور اس کی نگاہ میں وہ سب انسان یکساں ہیں جو اس کے اصول قبول کر کے اس کی بنائی ہوئی عالمگیر برادری میں شامل ہو جائیں۔ بلکہ یہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کرتا جو گوروں نے کالوں کے ساتھ کیا، جو سامراجی قوتوں نے اپنی محکوم قوموں کے ساتھ کیا۔ جو کمیونسٹ حکومتوں نے اپنے دائرہ اقتدار میں رہنے والے غیر کمیونسٹوں کے ساتھ، حتّٰی کہ خود اپنی پارٹی کے غیر مرغوب ارکان کے ساتھ کیا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسانیت کی فلاح کے لیے وہ کیا اصول ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے پیش فرمائے ہیں اور ان میں کیا بات ایسی ہے جو نہ صرف علاج انسانیت کی ضامن ہے بلکہ تمام انسانوں کو ایک وحدت کی لڑی میں پرو کر ایک امت بھی بنا سکتی ہے۔

اللہ کی وحدانیت کا وسیع ترین تصوّر

ان میں سب سے مقدم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا ہے۔ صرف اس معنیٰ میں نہیں کہ اللہ ہے، اور محض اس معنیٰ میں بھی نہیں کہ اللہ بس ایک ہے۔ بلکہ اس معنیٰ میں کہ اس کائنات کا واحد خالق، مالک، مدبّر اور حاکم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کوئی دوسری ہستی پوری کائنات میں ایسی نہیں ہے جس کے پاس حاکمیت کا اقتدار ہو، جس کو حکم دینے اور منع کرنے کا حق ہو، جس کے حرام کرنے سے کوئی چیز حرام اور جس کے حلال کرنے سے کوئی چیز حلال ہو سکتی ہے۔ یہ اختیارات اس کے سوا کوئی نہیں رکھتا۔ کیونکہ جو خالق اور مالک ہے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے بندوں کو اپنی پیدا کردہ دنیا میں جس چیز کی چاہے اجازت دے اور جس سے چاہے منع کر دے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ اللہ کو اس حیثیت سے مانو کہ ہم اس کے سوا کسی کے بندے نہیں ہیں اور اس کے قانون کے خلاف کسی کو ہم پر حکم چلانے کا حق نہیں ہے۔ اس حیثیت سے مانو کہ ہمارا سر اُس کے سوا کسی کے سامنے جھکنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ اس حیثیت سے مانو کہ ہماری تقدیر بنانے اور بگاڑنے والا صرف وہی ہے۔ اس حیثیت سے مانو کہ ہمارا جینا اور مرنا بالکل اس کے اختیار میں ہے۔ جس وقت چاہے ہمیں موت دے سکتا ہے اور جس وقت تک چاہے ہمیں زندہ رکھ سکتا ہے۔ اس کی طرف سے موت آئے تو دنیا کی کوئی طاقت بچا لینے والی نہیں اور وہ زندگی عطا کرے تو دنیا کی کوئی طاقت ہلاک کر دینے والی نہیں۔ یہ ہے اسلام کا تصورِ خدا۔

اکی تابع فرمان

اس تصور کے مطابق زمین سے لیکر آسمانوں تک ساری کائنات خدا

بردار

ہے اور انسان جو اس کائنات میں رہتا ہے، اس کا بھی یہی کام ہے کہ خدا ہی کا تابع فرمان بن کر رہے ۔ اگر وہ خود مختار بنے یا خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت اختیار کرے تو اس کی زندگی کا نظام پورے نظام کائنات کے خلاف ہو جائے گا ۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھے کہ ساری کائنات خدا خدا کے حکم کے تحت چل رہی ہے ۔ یہ ایک امر واقعی ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا ۔ اب اگر ہم خدا کے سوا کسی اور کے حکم کے تحت چل رہے ہوں، یا اپنی مرضی کے مختار بن کر جدھر جی چاہے چل رہے ہوں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہماری زندگی کی گاڑی پوری کائنات کی گاڑی کے خلاف سمت میں چل رہی ہے ۔ ایک مستقل تصادم ہے جو ہمارے اور نظام کائنات کے درمیان ہو رہا ہے ۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے ۔ اس تصور کے مطابق انسان کے لیے صحیح طریقۂ حیات (WAY OF LIFE) صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے، کیوں کہ وہ مخلوق ہے اور اللہ اس کا خالق ہے ۔ مخلوق ہونے کی حیثیت سے اس کا خود مختار بن جانا بھی غلط ہے، اور اپنے خالق کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا بھی غلط ۔ ان دونوں راستوں میں سے جو راستہ بھی وہ اختیار کرے گا وہ حقیقت سے متصادم ہو گا، اور حقیقت سے ٹکرانے کا نقصان خود ٹکرانے والے ہی کو پہنچتا ہے ۔ حقیقت کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا

بندگیٔ رب کی دعوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت یہ ہے کہ اس تصادم کو ختم کرو ۔ تمہاری زندگی کا

اور ضابطہ بھی وہی ہونا چاہیئے جو پوری کائنات کا ہے۔ تم نہ خود قانون ساز بنو اور نہ کسی دوسرے کا یہ حق تسلیم کرو کہ وہ خدا کی زمین میں خدا کے بندوں پر اپنا قانون چلائے۔ قانونِ برحق صرف خداوندِ عالم کا قانون ہے۔ باقی سب قوانین باطل ہیں۔

اطاعتِ رسول کی دعوت

یہاں پہنچ کر ہمارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا دوسرا نکتہ آتا ہے اور وہ آپؐ کا یہ دوٹوک بیان ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا نبی ہوں اور نوعِ انسانی کے لیے اُس نے اپنا قانون میرے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ میں خود بھی اس قانون کا پابند ہوں۔ خود مجھے بھی اس میں تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے میں اتباع کرنے پر مامور ہوں۔ اپنی طرف سے کوئی نئی چیز اختراع کرنے کا مجاز نہیں ہوں یہ قرآن وہ قانون ہے جو مجھ پر خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور میری سنت وہ قانون ہے جو خدا کے حکم و ارشاد کی بنا پر میں جاری کرتا ہوں۔ اس قانون کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے والا سب سے پہلے میں ہوں (اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ) اس کے بعد تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ ہر دوسرے قانون کی پیروی چھوڑ کر اس قانون کی پیروی کریں۔

اللہ کے بعد اطاعت کا مستحق اللہ کا رسول ہے

کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی سنت کی اطاعت و پیروی کیسے کر سکتے تھے جبکہ وہ آپؐ کا اپنا ہی قول یا فعل ہوتا تھا؟ اس معاملے کی اصل حیثیت یہ ہے کہ قرآن جس طرح خدا کی طرف سے تھا اُسی طرح رسول ہونے کی حیثیت سے جو حکم آپ دیتے یا جس کام سے آپؐ منع فرماتے، یا جس طریقے کو آپ مقرر کرتے تھے، وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوتا تھا

اسی کا نام سنت رسول ہے، اور اس کی پیروی آپ خود بھی اسی طرح کرتے تھے جس طرح سب اہل ایمان کے لئے اس کی پیروی لازم تھی۔ یہ بات ایسے مواقع پر پوری طرح واضح ہو جاتی تھی جب صحابہ کرام کسی معاملے میں آپ سے پوچھتے تھے کہ یا رسول اللہ کیا آپ یہ اللہ کے حکم سے فرما رہے ہیں یا یہ آپ کی اپنی رائے ہے؟ اور آپؐ جواب دیتے تھے کہ اللہ کا حکم نہیں ہے بلکہ میری رائے ہے یہ معلوم ہونے کے بعد صحابہؓ حضور کی رائے سے اختلاف کر کے اپنی تجویز پیش کرتے تھے اور آپؐ اپنی رائے چھوڑ کر اُن کی تجویز قبول فرما لیتے تھے۔ اسی طرح یہ بات اُن مواقع پر بھی کھل جاتی تھی جب آپ کسی معاملے میں صحابہؓ سے مشورہ طلب فرماتے تھے۔ یہ مشاورت خود اس امر کی دلیل ہوتی تھی کہ اس معاملے میں خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا ہے، کیونکہ خدا کا حکم ہوتا تو اس میں مشاورت کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ ایسے مواقع رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں بار ہا پیش آئے ہیں جن کی تفصیلات احادیث میں ہم کو ملتی ہیں۔ بلکہ صحابہ کا تو یہ بیان ہے کہ ہم نے حضورؐ سے زیادہ مشاورت کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ اس پر آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہو گا کہ یہ بھی حضور کی سنت ہی تھی کہ جس معاملہ میں اللہ کا حکم نہ ہو اس میں مشورہ کیا جائے اور کوئی دوسرا حاکم تو درکنار، اللہ کا رسول تک اپنی ذاتی رائے کو لوگوں کے لیے فرمان واجب الاذعان نہ قرار دے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو شوریٰ کے طریقے سے کام کرنے کی تربیت دی اور لوگوں کو یہ سکھایا کہ جس معاملہ میں حکم الٰہی ہو اس میں بے چون وچرا اطاعت کرو اور جہاں حکم الٰہی نہ ہو وہاں آزادیٔ اظہار رائے کا حق بے خوف و خطر استعمال کرو۔

آزادی کا حقیقی چارٹر

یہ نوعِ انسانی کے لیے آزادی کا وہ چارٹر ہے جو دینِ حق کے سوا دنیا میں کسی نے

اُس کو نہیں دیا۔ اللہ کے بندے صرف ایک اللہ ہی کے بندے ہوں اور کسی کے بندے نہ ہوں
حتیٰ کہ اللہ کے رسول کے بندے بھی نہ ہوں، اس نے انسان کو ایک خدا کے سوا ہر دوسرے کی بندگی سے
آزاد کر دیا اور انسان پر سے انسان کی خدائی ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔ اس کے ساتھ ایک عظیم ترین
نعمت جو اس پیغام نے انسان کو عطا کی وہ ایک ایسے قانون کی بالاتری ہے جسے توڑنے مروڑنے
اور رد و بدل کا تختۂ مشق بنانے کا اختیار کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر یا جمہوری مجلس قانون ساز یا اسلامؐ
قبول کرنے والی کسی قوم کو حاصل نہیں ہے۔ یہ قانون خیر و شر کی مستقل قدریں (PERMANENT
VALUES) انسان کو دیتا ہے جنہیں بدل کر کبھی کوئی خیر کو شر اور شر کو خیر نہیں بنا سکتا۔

تیسری بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندگانِ خدا کو بتائی وہ یہ ہے کہ تم
خدا کے سامنے جوابدہ ہو۔ تم اس دنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیئے گئے ہو کہ اپنی مرضی
سے جو چاہے کرتے رہو، جس کھیت میں چاہو چرتے پھرو، اور کوئی تمہیں پوچھنے والا نہ ہو، بلکہ تم
اپنے ایک ایک فعل، ایک ایک قول اور اپنی پوری اختیاری زندگی کے اعمال کا حساب اپنے
خالق و معبود کو دینے والے ہو۔ مرنے کے بعد تمہیں اٹھنا پڑے گا اور اپنے رب کے سامنے باز پرس
کے لیے پیش ہونا پڑے گا۔

یہ ایک ایسی زبردست اخلاقی طاقت ہے جو اگر انسان کے ضمیر میں جاگزیں ہو جائے
تو اُس کا حال ایسا ہوگا جیسے اُس کے ساتھ ہر وقت ایک چوکیدار لگا ہوا ہے جو بُرائی کے ہر ارادے
پر اُسے ٹوکتا اور ہر اقدام پر اُسے روکتا ہے۔ باہر کوئی گرفت کرنے والی پولیس اور سزا دینے والی
حکومت موجود ہو یا نہ ہو، اس کے اندر ایک محتسب ایسا بیٹھا رہے گا جس کی پکڑ کے خوف سے
وہ کبھی خلوت میں، یا جنگل میں، یا اندھیرے میں، یا کسی سنسان جگہ میں بھی خدا کی نافرمانی نہ کر سکے گا
اس سے بڑھ کر انسان کی اخلاقی اصلاح اور اس کے اندر ایک مستحکم کردار پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں

ہے۔ دوسرے جتنے ذرائع سے بھی آپ اخلاق سنوارنے کی کوشش کریں گے، اس سے آگے نہ بڑھ
سکیں گے کہ بھلائی دنیا میں فائدہ مند اور برائی نقصان دہ ہے۔ اور یہ کہ ایمانداری ایک اچھی پالیسی
ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پالیسی کے اعتبار سے اگر برائی اور بے ایمانی مفید ہو اور اُس سے
نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو اُسے بلا تکلف کر ڈالا جائے۔ اسی نقطہ نظر کا تو یہ نتیجہ ہے کہ جو لوگ اپنی
انفرادی زندگی میں اچھا رویہ رکھتے ہیں وہی اپنے قومی کردار میں انتہا درجے کے بے ایمان، دغاباز، لٹیرے
اور ظالم و جابر بن جاتے ہیں بلکہ انفرادی زندگی میں بھی وہ اگر بعض معاملات میں اچھے ہوتے ہیں تو بعض
دوسرے معاملات میں بھی بُرے ہوتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک طرف وہ کاروبار میں کھرے اور
برتاؤ میں خوش اخلاق ہیں تو دوسری طرف شرابی، زانی، جواری اور سخت بدکار اور سیاہ کار ہیں۔ اُن کا
مقولہ یہ ہے کہ آدمی کی پبلک زندگی اور چیز ہے اور پرائیوٹ زندگی اور نجی زندگی کے کسی عیب پر
کوئی ٹوکے تو اُن کا گھڑا گھڑایا جواب یہ ہوتا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔

اس کے بالکل برعکس آخرت کا عقیدہ ہے جو کہتا ہے کہ برائی ہر حال میں برائی ہے خواہ دنیا میں
وہ مفید ہو یا نقصان دہ۔ وہ شخص خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس رکھتا ہو اس کی زندگی میں
پبلک اور پرائیوٹ کے دو شعبے الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ وہ ایمان داری اختیار کرتا ہے تو اس وجہ
سے نہیں کہ یہ اچھی پالیسی ہے، بلکہ اس کے عین وجود میں ایمان داری شامل ہوتی ہے اور وہ سوچ ہی
نہیں سکتا کہ اس کا کام کبھی بے ایمانی کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا عقیدہ اسے یہ سکھاتا ہے کہ تم
اگر بے ایمانی کرو گے تو جانوروں کی سطح سے بھی نیچے جا پڑو گے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ۔ "ہم نے
انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اسے اوندھا کر سب نیچوں سے نیچ کر دیا"۔

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے انسان کو صرف ایک مستقل اخلاقی

اقدار رکھنے والا ناقابل تبدیلی قانون ہی نہیں ملا، بلکہ انفرادی اور قومی اخلاق وکردار کے لئے ایک ایسی بنیاد بھی مل گئی جو کبھی متزلزل ہونے والی نہیں ہے جو اس بات کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی حکومت موجود ہو، کوئی پولیس موجود ہو، کوئی عدالت موجود ہو۔ تو آپ سیدھے راستے پر چلیں، ورنہ مجرم بن کر رہیں۔

رہبانیت کے بجائے دنیاداری میں اخلاق کا استعمال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ایک اور اہم سبق ہمیں دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق راہبوں کے گوشۂ عزلت کے لیے نہیں ہے، درویشوں کی خانقاہوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ دنیا کی زندگی کے ہر شعبے میں برتنے کے لئے ہے۔ جس روحانی اور اخلاقی بلندی کو دنیا فقیروں اور درویشوں میں تلاش کرتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے حکومت کی مسند پر اور عدالت کی کرسی پر اٹھا لائے۔ آپ نے تجارت کے کاروبار میں خداترسی اور دیانت سے کام لینا سکھایا۔ آپؐ نے پولیس اور فوج کے سپاہیوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کا سبق دیا۔ آپ نے انسان کی اس غلط فہمی کو دور کیا کہ خدا کا ولی وہ ہوتا ہے جو تارک الدنیا ہو کر بس اللہ اللہ کرتا رہے۔ آپ نے بتایا کہ ولایت اس کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل ولایت یہ ہے کہ آدمی ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک تھانیدار، ایک تاجر وصنعت کار اور دوسری تمام حیثیتوں سے ایک پورا دنیادار بن کر بھی ہر اس موقع پر اپنا خداترس اور دیانت دار ہونا ثابت کردے جہاں اس کے ایمان کو آزمائش سے سابقہ پیش آئے۔ اس طرح آپ اخلاق وروحانیت کو رہبانیت کے گوشوں سے نکال کر معیشت ومعاشرت، سیاست وعدالت اور صلح وجنگ کے میدانوں میں لے آئے اور یہاں پاکیزہ اخلاق کی حکمرانی قائم کی۔

حضور کی ہدایت کا فیض :۔ یہ اسی رہنمائی کا فیض تھا کہ اپنی نبوت

کے آغاز میں جن لوگوں کو آپؐ نے ڈاکو پایا تھا ان کو اس حالت میں چھوڑا کہ وہ امانت دار اور خلق خدا کی جان و مال اور آبرو کے محافظ بن چکے تھے۔ جن لوگوں کو حق مارنے والا پایا تھا انہیں حق ادا کرنے والا، حقوق کی حفاظت کرنے والا اور حقوق دلوانے والا بنا کر چھوڑا۔ آپؐ سے پہلے دنیا اُن حاکموں سے واقف تھی جو ظلم و جور سے رعیت کو دبا کر رکھتے تھے۔ اور اونچے اونچے محلوں میں رہ کر اپنی خدائی کا سکہ جماتے تھے۔ آپؐ نے اسی دنیا کو ایسے حاکموں سے روشناس کرایا جو بازاروں میں عام انسانوں کی طرح چلتے تھے۔ اور عدل و انصاف سے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ آپ سے پہلے دنیا ان فوجوں سے واقف تھی جو کسی ملک میں گھستی تھیں تو ہر طرف قتلِ عام برپا کرتی تھیں، بستیوں کو آگ لگاتی اور مفتوح قوم کی عورتوں کو بے آبرو کرتی پھرتی تھیں۔ آپؐ نے اسی دنیا کو ایسی فوجوں سے متعارف کرایا جو کسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوتیں تو دشمن کی فوج کے سوا کسی پر دست درازی نہ کرتی تھیں اور فتح کیے ہوئے شہر سے اگر پسپا ہوتیں تو اہلِ شہر سے وصول کیے ہوئے ٹیکس تک انہیں واپس کر دیتی تھیں۔ انسانی تاریخ ملکوں اور شہروں کی فتح کے قصوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر فتح مکہ کی کوئی نظیر آپ کو تاریخ میں نہ ملیگی۔ جس شہر کے لوگوں نے تیرہ برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم و ستم ڈھایا تھا۔ اسی شہر میں آپؐ کا فاتحانہ داخلہ اس شان سے ہوا تھا کہ آپ کا سر خدا کے آگے جھکا جا رہا تھا۔ آپؐ کی پیشانی اونٹ کے کجاوے سے لگی جا رہی تھی، اور آپ کے طرزِ عمل میں غرور و تکبر کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہی لوگ جو تیرہ برس تک آپؐ پر ظلم و ستم کرتے رہے تھے۔ جنھوں نے آپؐ کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا اور جو ہجرت کے بعد بھی آٹھ برس تک آپ سے برسرِ جنگ رہے تھے، جب مغلوب ہو کر آپؐ کے سامنے پیش ہوئے تو انھوں نے آپ سے رحم و کرم کی التجا کی اور آپؐ نے انتقام لینے کے بجائے فرمایا کہ لا تثریب علیکم الیوم ۲ ذھبوا فانتم الطلقاء "آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ، تم چھوڑ دیئے گئے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نمونے کا جو اثر آپؐ کی اُمت پر پڑا ہے اس کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو تاریخ میں خود دیکھ لے کہ مسلمان جب اسپین میں داخل ہوئے تو اُن کا رویہ کیا تھا اور جب عیسائیوں نے ان پر فتح پائی تو اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں جب عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ اور مسلمانوں نے جب بیت المقدس کو ان سے واپس لیا تو عیسائیوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ کیا تھا۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک بحرِ ذخار ہے جس کا احاطہ کسی بڑی کتاب میں بھی ممکن نہیں ہے کجا کہ ایک تقریر میں کیا جا سکے۔ تاہم میں نے زیادہ سے زیادہ ممکن اختصار کے ساتھ اس کے چند نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس واحد ذریعۂ ہدایت سے رہنمائی حاصل کریں۔

وآخر دعوانا اَنِ الحمدُ للہِ ربّ العالمین۔